نقش بر آب

نظمیں

ابرارالحسن

شہرزاد
SCHEHERZADE

Naqsh Ber Aab

Abrar ul Hasan

اشاعت: ۲۰۰۴ء

کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی

سرورق: ابرارالحسن

طباعت: دی سمیع سنز پرنٹرز، کراچی

SCHEHERZADE

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

info@scheherzade.com

شریکِ سفر پریما وؔیرا کے نام
آؔرم اور عباؔس کے لیے ایک تحفہ

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اُسی کا مشتاق ہے زمانہ
اقبالؔ

ترتیب

پیش لفظ ۹
ایک خط ۱۱
نمائش ۱۳
تنہائی ۱۴
سکوت ۱۵
قاصد ۱۶
آ گہی ۱۷
اسرائیل ۱۹
آنکھ مچولی ۲۰
وسعتیں ۲۱
روشنی کے بوجھ ۲۲
کھیل ایک بچّے کا ۲۴
اُداسی ۲۶

روزخوابی ۲۸
جنگل، جنگل ۳۰
جادوگروں کی بستی ۳۲
محدود ۳۴
توازن ۳۶
اُلفت ۳۷
تگ و دو مسلسل ۳۹
ہمسفری ۴۱
پارک دے سیں گلو ۴۲
مِلّی ترانہ ۴۴
گِرد و پیش میں بکھرا بکھرا ۴۶
انقلابی ۴۸
پاگل ۴۹
دوبدو ۵۰
وہ بات ۵۲
پیرس ۱۔ ملاقات:۱ ۵۴
پیرس ۲۔ ملاقات: ۲ ۵۶
پیرس ۳: واپسی ۵۸
جنوبی افریقہ ۱: برسات ۶۰
جنوبی افریقہ ۲: مساوات ۶۱
یہ کہاں جائیں گے؟ ۶۲
سینہ بہ سینہ ۶۴

مشغول ۶۵

سچ؟ ۶۶

تلاش ۶۸

تہمت ۶۹

قیدی ۷۰

فقیروں کی بستی ۷۱

حاکم ۷۲

پہچان ۔ ا ۷۴

دامن کشاں ۷۵

آگ کی پیاس ۷۶

علم کے فاصلے ۔ ا ۷۷

علم کے فاصلے ۔ ۲ ۷۸

ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں ۷۹

وِجدان ۸۱

ساتھ ساتھ ۸۲

پُرخطر سفر ۸۳

تتلی ۸۵

خرید و فروخت ۸۶

تحفہ ۸۷

قربت سے دوری ۸۹

لگان ۹۰

ٹِک ٹِک ۹۱

ظفر زیدی مرحوم کی تصویر دیکھ کر ۹۳
آشنا سے ۹۴
پہچان ۔۲ ۹۶
ہمالہ ۹۸
نقش بر آب ۱۰۰
مونتاں ۱۰۳
آخری لو ۱۰۵
تیز ذرا ۱۰۷
سپردگی ۱۰۹
پیار کے تحفے ۱۱۱
اِبلیس ۱۱۳
بے نام ۱۱۵
بے حسی......دسمبر چھیاسی ۱۱۷
موہنجو دڑو ۱۱۹
دو آتشہ ۱۲۱
تجدید ۱۲۳
دیوارِ گریہ ۱۲۴

پیش لفظ

اس مجموعے کی بیشتر نظمیں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں، ۸۴ سے ۸۶ء کے دوران لکھی گئیں تھیں۔ اُن دنوں میں تازہ تازہ کینیڈا سے فرانس آیا تھا اور شعری حسّیات کے ایک نئے جذبے سے سرشار تھا۔ لگ بھگ بیس سالوں تک یہ نظمیں فائلوں میں گردخوری کے مزے لیتی رہیں۔ اب اس وقت اشاعت کی سب سے اہم وجہ میری رفیقۂ حیات روحی نصرت ہیں۔ وہ ان نظموں کو نہ صرف قابل اشاعت سمجھتی ہیں بلکہ ارادے کی اوالعزم بھی ہیں۔ ''نقش برآب'' اُن کے نام معنون ہے۔ پھر بھلا ہو میرے عزیز ترین دوست ڈاکٹر خالدسہیل کا جنہوں نے اشاعت پر اُکسایا۔ اور ڈاکٹر آصف فرخی سے، جن سے کئی سال پہلے پیرس میں ملاقات ہوئی تھی، تجدیدی تعارف کرایا۔ آصف فرخی نے مسّودہ دیکھ کر خندہ دلی سے اشاعت کی حامی بھری۔ میں ان تینوں ہستیوں کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کی مدد کے بغیر یہ نظمیں منظرعام پر نہیں آ سکتی تھیں۔

اشاعت کے سلسلے میں نظر ثانی کرتے ہوئے میں نے ان نظموں کو اکیسویں صدی کے اوائل سالوں کے حالات کے لیے اور بھی برمحل پایا۔ گو چند نظموں کو بنیادی طور پر حسّی شاعری کا اظہار کہا جاسکتا ہے (مثلاً آنکھ مچولی، پارک دے سیں گلو وغیرہ) لیکن اس مجموعے کی زیادہ تر نظمیں پاکستان، اور پاکستان سے ملتے جلتے تیسری دنیا کے دیگر ممالک، کے اُس عبوری دور کے بحران کی عکاسی کرتی ہیں جن میں ایک عالم پیر قریب المرگ ہے اور ایک جہان نو کے نمود کی کشمکش ہے۔ قدروں کی شکست وریخت، تضادات کی ارزانی، اور نئی جہت، نئی قدروں کی تلاش ان نظموں کے مرکزی خیالات ہیں۔

میرا پہلا شعری مجموعہ ''دائرے'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں آٹوا، کینیڈا سے شائع ہوا تھا۔ اُس میں شامل نظموں کو بھی ''نقش برآب'' کی نظموں کی طرح، فکری نظمیں کہا جاسکتا

ہے۔ یہ بات اس مجموعے میں شامل علی سردار جعفری کے ۱۹۸۴ء کے اُس خط سے واضح ہوسکتی ہے جو اُنہوں نے مجھے ''دائرے'' کے بارے لکھا تھا۔ مجھے افسوس ہی رہ گیا کہ میں بعد کی نظمیں اُن کی خدمت میں پیش نہیں کر سکا۔

''دائرے'' کے حرفِ اوّل میں نظموں کے باہمی ربط اور ارتقا پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ''فی الحال میری فکر کا پڑاؤ یہیں ہوتا ہے اگر سوچ آگے بڑھ سکی تو یقیناً اطلاع دی جائے گی۔'' تو اب سوچ کی اگلی منزل کی خبر شعری الفاظ میں آپ کے سامنے ہے اور تاریخ وار درج ہے۔ اگر فرصت ملی تو ان خیالات کو نثری پیرائے میں بھی بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

ابرارالحسن

پیرس ۱۲ جنوری ۲۰۰۴ء

ایک خط

Ali Sardar Jafri
Padma Shree
Special Executive Magistrate

10- Seeta Mahal
Bomanji Petit Road,
Bombay - 400036

۷/ جولائی ۱۹۸۴ء

بھائی ابرار الحسن صاحب۔ تسلیم

ایک پرانی کہاوت ہے آپ نے بھی سنی ہوگی .... ''بن مانگے موتی ملے مانگے ملے نہ بھیک۔'' آپ کی نظموں کی کتاب موتی کا ایک دانہ ہے جو بیدار بخت لے کر آئے ہیں، بہت شکریہ، آپ کا نام بہت مانوس معلوم ہوتا ہے۔ سنا ہوگا یا ممکن ہے کہ کبھی کینیڈا میں ملاقات بھی ہوئی ہو۔ لیکن مجھے آپ کی شاعری کا قطعاً علم نہیں تھا۔ نظمیں حیرت اور مسّرت کے ساتھ پڑھیں۔ کچھ نظمیں بہت پسند آئیں۔ آفاقی سچ یا آفاقی حقیقت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آفاق سے آپ کی مراد کائنات ہے یا Cosmos ہے جس کے لئے میرے پاس اردو کا کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ میں آفاق کا لفظ Cosmos کے معنوں میں استعمال کرتا ہوں۔ میری نئی نظم جو میری زندگی کے متعلق ہے، اور میری ذات کے ذریعے سے اس صدی اور ہم عصر تاریخ کے متعلق ہے اس کے پہلے بند میں ایک مصرعہ ہے ''میں ستّر سال پہلے اس تماشا گاہ عالم میں /اک آفاقی کھلونا تھا'' .... بہت سے مقامات پر میں نے محسوس کیا کہ میرے افکار آپ کے افکار سے قریب ہیں، صرف انداز بیان مختلف ہیں، آپ کی نظم ''آج'' ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کہی ہے۔ اور میں اپنا ایک شعر تحفتہً بھیج رہا ہوں، اس میں شاید آپ کو اپنے افکار کے دل دھڑکنے کی آواز سنائی دے ؎

چھوڑ کر وہم و گماں حُسنِ یقیں تک پہونچو
پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ

ایک اور شعر ؎

در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہے جواب

میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ گزشتہ چالیس پچاس سال کی اردو شاعری کے پاس سب سے بڑا سرمایہ رومانی اور احتجاجی نظموں کا ہے۔ جدید تر نظموں کا موضوع کسی نہ کسی شکل میں بیگانگی ہے۔ اس کی وجہ سے فکری شاعری کی طرف سے توجّہ ہٹ گئی۔ غالب اور اقبال سے بے حد دلچسپی کے بعد بھی آج کا عہد فکری شاعری سے محروم ہے۔ ''دائرے'' کی شاعری کو غیر رومانی تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے ساتھ وہ فکری شاعری ہے۔ آپ کے یہاں رومانی کیفیت جنسی یا Erotic نہیں ہے۔ یہاں اپنے احباب کو بھی آپ کی کتاب پڑھنے کے لئے دے رہا ہوں۔ وقت نکال کر اس پر انگریزی اور اردو میں تبصرہ بھی کروں گا، اور تراشے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر آپ نے کتاب پر لکھ دیئے ہیں۔ بیدار بخت نے زبانی آپ کی طرف سے پیرس آنے کی دعوت بھی دی۔ میں اتفاق سے ۱۹۵۴ء کے بعد سے پیرس نہیں گیا۔ آنے کو جی چاہتا ہے۔ میری شاعری میں پیرس کا خاصا ذکر ہے۔ اور وہاں کے عظیم شاعر لوئی آراگوں سے میری ملاقات تھی۔

میں اگست میں کینیڈا جاؤں گا اور ستمبر کے آخر تک واپسی کا ارادہ ہے، کینیڈا جانے کی صحیح تاریخ کا تعین نہیں ہوا ہے۔ اس کی اطلاع ملتے ہی آپ کو خبر کردوں گا اور لندن سے ٹیلیفون پر بات کروں گا، لندن سے پیرس آنا بہت آسان ہوگا۔ شانزالیزے اور دریائے سین کے حسن کو میرا سلام، اس خط کا جواب ضرور تحریر فرمایئے تاکہ یقین ہو کہ خط آپ کو مل گیا۔ ابھی تک یہ بھی طے نہیں ہے کہ میں لندن میں کہاں قیام کروں گا۔ بہر حال روانہ ہونے سے پہلے آپ کو قیام گاہ کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھ دوں گا۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا
علی سردار جعفری

نمائش

رات میں بھی گیا......
اک نمائش تھی عمدہ تصاویر کی......
شہر کے چیدہ چیدہ معزز خواتین وحضرات
چہروں پہ موزوں ملاوٹ......
نفاست کی،
سنجیدگی کی،
فنونِ لطیفہ کے ادراک کی......
اپنی موجودگی سے یقیں دوسروں کو دلاتے ہوئے
کتنے باذوق ہیں
[کاش خود بھی یقیں کرسکیں]

رات اچھی نمائش تھی
میں بھی نمائش میں تصویر تھا۔

آٹوا
۱۷/اپریل ۸۰ء

تنہائی

شام بوجھل سی
گھنے پیڑ سے آنگن میں اُتر آئی ہے،
دفن ہونے کو ہے بے نام سا دن
جس سے رِستے ہیں لہو رنگ شفق کے دھبے۔
پھیلتے جاتے ہیں گہرے بادل،
جیسے احساسِ گنہہ۔

زرد، مرجھائی، اکیلی قندیل،
نوحہ انڈیلتی، سوزش کی سفیر،
جسم دیوار پہ سایوں میں بٹا،
ٹوٹی امید کی گریاں تصویر۔

اور اب رات نے کروٹ بدلی،
گہرے سناٹے کی خاموش کراہ،
جیسے پھر زخم کے ٹانکے جاگے،
لمحہ لمحہ کے ٹپکنے کی صدا آتی ہے۔

آٹوا
۲۸/ستمبر ۸۱ء

سکوت

رات پھیلتی گئی ہے
دُور، دُور، جنگلوں میں
راستہ ٹٹولتی،
ہوا کی سائیں سائیں،
جیسے سانس رُک رہی ہو،
اوس سوگوار
زار، زار رو رہی ہو،
لالہ زار میں گُلوں کی پتّیاں
بکھر کے راکھ ہو رہی ہوں۔

آخری امید
ٹمٹما کے بجھ گئی ہے،
وقت بہہ چکا ہے،
تھم گیا ہے،
سائیں سائیں رک گئی ہے۔

آٹوا
۷/اکتوبر ۸۲ء

قاصد

اندھیری رات میں
پھیلائے ہاتھوں کو
ٹٹولیں راستہ
پتھر،
کوئی دیوار،
سر ٹکرائے تو احساس ہو جائے
کہ زندہ ہیں۔

صریرِ نرم، لمسِ غیر،
سانسوں کا لپٹنا گرم شدّت سے،
تو یہ احساس ہو جائے کہ زندہ ہیں۔

کوئی تو آگہی دے......
کون ہے جو منتظر ہے
اپنے جینے کی خبر کا
اک زمانے سے؟

آٹوا
۸/ نومبر ۸۲ء

آ گہی

دو قدم آ گے بڑھاؤ،
اک قدم پیچھے ہٹو،
ناچ کر ہاتھوں سے اک پُر زور تال!
تن تھرکتے، سر جھٹکتے، بکھرے بال!
بازوؤں کی رہبری، آنکھیں مندی،
نشّہ جیسے بادلوں میں پینگ دے،
جیسے بڑھتی آرزوؤں کی امنگ
آسماں کی حد، افق کی ڈور چھونے کی ترنگ،
اور ہوشانوں کو جنبش،
تال کی لے تیز تر!

زندگی، چڑھتا نشہ، سیلاب سا،
روزِ روشن کی طرح اپنا جواز،
بخشتی ہے قطرۂ بے نام کو،
سب سوالوں کے جواب،
ماورائے فہم، لیکن دل کے پاس،
روشنی اپنی حقیقت آپ ہے،
کوئی سورج کو دکھاتا ہے چراغ!

قطرۂ تنہا، بچھڑ کر موج سے
تیرگی کے دشت میں بے آسرا،
رقص ہے، نغمہ نہ تال،
آ گہی کی روشنی کیسے ملے،
آ گہی تو نام ہے احساس کا......
رابطے کی اک کڑی، یا
موج کے اک جز و ہونے کا مزہ!

پیرس
۷/نومبر ۸۳ء

اسرائیل

وہ جامد آنکھیں
جو قاتلوں کو نہ بخش پائیں،
وہ نفرتوں کو ثبات دے کر
تمام انصاف کے حوالوں کو مردہ نظروں سے گھورتی ہیں،
ہر ایک آہٹ پہ چونکتی ہیں،
ہر ایک کھٹکے ہر ایک سائے سے لڑ رہی ہیں۔

یہ خوگرِ ظلم کیا کرے، گر
نظامِ عالم کی بذلہ سنجی خود اس کے فرعون کو ڈبو دے؟
نئے فراعین لے کے آئے؟
وہ اُن کی روحوں کو آپ اپنے بدن میں پالے؟

یہ کیسا سنگین سانحہ ہے!
یہ ہو کے آزاد اس فضا سے گریز پا ہے،
وہ نفرتیں، ظلم ڈھونڈتا ہے
کہ جن سے صدیوں کی اُنسیت تھی۔
یہ ظالموں کی عجب عطا ہے
کہ نسلِ مظلوم اپنے پیکر سے ظالموں کو تراشتی ہے!

پیرس، ۷/نومبر ۸۳ء

آنکھ مچولی

کن کن پھولوں کی،
برساتوں کی،
چاندی کی چھم چھم کرنوں کی،
چمکیلی، سوندھی ریتوں کی،
یادوں کو بھرلوں آنکھوں میں!

خوابیدہ گلشن کی راہیں
کتراتی ڈالی ڈالی سے
پیڑوں میں یوں کھو جاتی ہیں
جیسے برسوں کے بچھڑے سے،
سینے لگ کر سو جاتی ہوں۔
میں کھوج لگاتے جب آؤں
دونوں جانب ہوں پیڑ کھڑے
بچّے جیسے دم سادھے سے،
اور اگلے موڑ پہ، پتّوں کے
آنچل میں رَوش پھر غائب ہے!

پیرس
۲؍مئی ۸۴ء

وسعتیں

بادل کے پردوں سے،
تہہ دار کُہروں میں ڈوبا ہوا،
نور، لپٹا ہوا،
صبح کی اوّلیں دودھیا چھاؤں میں اک جھلک
آسمانوں کی وسعت کی،
رم جھم ٹپکتی ہوئی
جھیل کی پُرسکوں سَطح پر تیرتی،
یوں لگا، جیسے میری پہنچ میں یہیں آ گئی۔

سطح جاں سے اٹھی یہ دعا:
اس حسیں لمحۂ سحر آگیں میں خوشیوں سے بھر دے
مرے دل کی گہرائیوں کو......
تو آواز آئی کہ دامن بڑھا
اور جب دل کو وا کر دیا میں نے
تب اپنی کم مائیگی پہ بہت غم ہوا۔

پیرس
۲ر مئی ۸۴ء

روشنی کے بوجھ

ہوا اُڑائے ریشم بادل کے پردے،
چَھن چَھن کر پیڑوں سے اُتریں روشنیاں،
جیسے اچانک بچّوں کو آ جائے ہنسی،
جنگل تیرہ بخت نہیں!

چھن چھن کر چھتنار سے برسو روشنیو،
پودوں کی رگ رگ میں تیرو روشنیو،
جنگل کے سینے کے کونوں کھدروں میں
دبے ہوئے اسرار بہت،
خواب گزیدہ نشے میں سرشار بہت،
نیند نگر کو تجنے پر اصرار بہت،
کونپل کونپل پھوٹنے پہ تیار بہت!

بوڑھے پیڑ نہ رستہ روکو
ان خوابوں کو جی لینے دو،
چھن چھن کر چھتنار سے برسو روشنیو!

اس معصوم ہنسی میں گرچہ ربط نہیں،
پل بھر میں آنسو بن جائیں، ضبط نہیں،
اس موتی کے قلب میں اُترو روشنیو،
اور چمک اس کی چمکاؤ، روشنیو،
نگر نگر میں تم سا نازک لمس نہ پاؤں،
کرن کرن کے لیکن برسوں بوجھ اٹھاؤں۔

پیرس

۱۸ رمئی ۸۴ء

کھیل ایک بچّے کا

کھیل ایک بچّے کا......
جھیل کے کناروں سے
چُن کے سنگ ریزوں کو
پھینکتا ہے کچھ ایسے،
ڈوبتے، اُبھرتے ہیں،
سطحِ آب پر لرزاں
لہر چھوڑ جاتے ہیں،
دیکھتا ہے لہروں کو
پھیلتی ہوئی قوسیں،
دائرے کہاں پہنچے!

بے خبر دو عالم سے،
عالمِ تحیّر میں،
محویت کچھ ایسی ہے،
جیسے وقت خود رک کر
نیم باز آنکھوں سے
آپ ہو تماشائی!

کچھ وہ سنگ ریزے، جو
یوں پھسل کے گرتے ہیں
ایک لڑکھڑاہٹ سی
آہ سی اُترتی ہے،
لہر کم ہی اٹھتی ہے
دُور کم ہی جاتی ہے......

وقت رُک گیا ہے، اور
ہم، کہ سنگ ریزے ہیں،
سوچتے ہیں، دل کی ہُوک
ڈوبتی اُبھرتی سی،
سطحِ آب پر لہریں،
حاصلِ تگ و دو، بس
کھیل ایک بچّے کا؟

پیرس
۲۹؍مئی ۸۴ء

اُداسی

ابھی جنگ جاری ہے......
جلنے لگیں بستیاں،
اُٹھ رہا ہے دھواں،
ایک خوں ریز دریا درختوں کو سیراب کرتا ہے،
جنگل مئے ناب سے کتنا مسرور ہے!

جنگ جاری کہاں ہے......؟
وہ دیکھو پہاڑوں کے درّوں میں بھگدڑ مچی ہے،
بکھرتی ہوئی فوج کے سورما،
پیٹھ پر زخم کھانے کے شیدا،
اُنھیں کی ہے میراث ساری اُداسی،
جو بستی کے کھیتوں میں
گندم کے خوشوں میں، چھپ کر
شکم میں اترتی ہے
تاریک کمروں میں منھ کو چھپاتی ہے!

آواز دے......کوئی آواز دے!
آؤ برفیلی چوٹی پہ دوڑیں،
سمندر میں غوطے لگائیں،
تعاقب کریں موت کا،
اور ایسا بھی ہو،
زندگی، تحفۂ جنگ،
دوڑاتے گھوڑے سے،
بانہوں میں لے کر نکل جائیں سرپٹ کہیں،
دو گھڑی کے لیے!

ابھی جنگ جاری ہے......
جنگل کو سیراب کرتا ہے خوں ریز دریا،
کہ جنگل کا قانون بھی تو یہی ہے!

پیرس
۳/ جون ۸۴ء

روز خوابی

منڈلاتی تتلی کو،
رنگین شیشوں کی کھڑکی سے،
رس دار، الھڑ امنگوں کی خوشبو میں
لپٹے ہوئے پھل کے باغوں کی
جاذب نظر دوپہر میں،
مچلتے ہوئے
خواب پرور نگاہوں سے دیکھا
تو سورج...... جو بادل میں مدہوش تھا
پھینک کر سب لبادے
برسنے لگا:
''کون باغی ہے؟
میری ریاست میں ممنوع ہے داخلہ خواب کا!''
پھر۔۔۔جھلسنے لگیں تتلیاں
تمتماتے ہوئے پھل
پناہ کے طلب گار
پتوں میں منہ کو چھپانے لگے۔

اور تم دیکھتے......

کیسے نمناک خوشبو پریشاں اُڑی

اور تم دیکھتے......

کیسے پچھلے پہر

دن کی آوارگی سے پریشاں،

مرے خواب کی تتلیاں،

پھڑ پھڑاتی رہیں،

دیدۂ بے اماں پہ تڑپتی رہیں،

خواب دن کے، مری رات بے خواب کرتے رہے۔

پیرس

۵/جون ۸۴ء

جنگل، جنگل

یہ پکار
بار بار آتی ہے:
’’چھوڑ چھاڑ کر یہ گھر بار
جا جنگل میں دھیان لگا۔‘‘

جنگل، جنگل
طاقت والے،
ٹیڑھی گردن، سر اکڑائے،
ان کے تنوں سے لپٹی بیلیں
جیون کے رس چوس رہی ہیں
[اپنی انا کو بیچ رہی ہیں]
اور جڑوں کے پاس سسکتے
کرن کرن کا لمس ترستے
ننّھے پودے۔

چاروں اور یہ پھیلا جنگل
بڑھتا جنگل!
اور یہ بڑھتی تیز پکار
چھوڑ چھاڑ کر یہ گھر بار
جا جنگل میں دھیان لگا!

کس جنگل میں جوگی تجھ کو چین ملے؟

پیرس
۱۸/ جون ۸۴ء

جادوگروں کی بستی

یہ بستی ہے جادوگروں کی،
طلسمی زمانوں کی،
خوابوں کی،
برسوں سے ٹھہرا ہوا
وقت بے سُدھ پڑا ہے،
وہ آنگن کے کونے میں ٹُوٹا گھڑا،
حوض کی تہہ میں کائی جمی،
گھر کے پچھواڑے
نالا ذرا دُور پر بند ہے،
جیسے پانی بلندی و پستی کے سارے حقائق سے عاری رہا ہو،
ہوا [جاگتی ہے، ہمیشہ نئے سمت کی جستجو ہے]
سُلاتی ہے خوابوں کے رسیا کو، نغمہ
فقط اپنی آواز کی گونج ہے،
روبرو آئینہ،
جس کو ماضی کی رنگین پرچھائیاں خوش نما کر گئی ہیں۔

ہنسی پھوٹتی ہے،
سوا اپنی ہستی کے سب
بے سبب، بے بصر، بے نوا!

ہنسنے والو......
کہاں تک ہنسو گے،
یہ تم ہی بتا دو،
وہ کیسے قدم ہیں......اُٹھائیں نہ ہم اور طے فاصلے ہوں؟
کہاں ہیں وہ رستے......جنہیں ترک کر دیں مگر وہ ہمیں اپنی منزل پہ لائیں؟
وہ کیسے قوانین ہیں......جن کی تردید میں پیروی کے فوائد سے ہم فیض پائیں؟

چلو، ہنسنے والو، یہ تم ہی بتا دو
کہاں تک ہنسو گے،
یہ بستی ہے جادوگروں کی
ذرا غور سے دیکھنا
یہ ہنسی منجمد تو نہیں ہے!

پیرس
۲۸/جون ۱۹۸۴ء

محدود

اضافت کی دنیا سے آگے کہیں،
قدرِ پیمائش و قدرِ میزان خود ہی لچک دار،
ثابت نہ سیّار،
[سیّار و ثابت اضافی ہیں اک دوسرے کے لیے]
سمت بے سمت ہے،
وقت بے قید ہے
جی میں جب آئے رُک جائے،
بہہ جائے،
منزل نہ دوری،
کہ منزل تو اُن کے لیے ہے
مقیّد ہیں جو وقت میں!

ان سرکتے ہوئے بادلوں کا تماشا
یہاں گھاس پر لیٹ کر دیکھنا،
پاس ہی ناتواں مور کا قافلہ،
عزم چلتے چلے جانے کا،
[ایک چھوٹے سے مٹّی کے تودے میں ان کا قلعہ ہے]
کچھ ایسے پتنگے ہیں
اٹھارہ گھنٹوں کی ساری کہانی،

مِرے ایک دن میں
وہ بچپن، جوانی، بڑھاپے کے سارے مراحل کو
شدّت سے محسوس کرتے ہیں
[لمحوں میں ناپو تو اٹھارہ گھنٹے ہزاروں پہ حاوی ہیں
کم تو نہیں ہیں، مگر ان کو لمحوں میں ناپو ہی کیوں؟]

یہ بادل کی بے سَمت تفریح اک واہمہ ہے
کہ منزل مقرّر رہے اُن کی، اگر صاف واضح نہیں ہے،
یہ خواہش بہت ہے کہ
آزاد ہوں وقت سے،
چشمۂ آبِ حیواں سے سیراب ہوں
گردشوں سے بلندی ہو
نروان ہو اور خدا بن سکیں۔

خواب اچھے ہیں، لیکن
کوئی سمت تجویز کرلو،
کوئی قدر ہو اُس پہ ایمان لاؤ،
کوئی قدر ہو فرق پڑتا نہیں،
تم تو مخلوق ہو،
تم تو محدود ہو!

پیرس
۱؍جولائی ۸۴ء

توازن

برسوں بیٹھ کے سوچیں پھر بھی
ہاتھ کے آگے پڑا نوالہ
آپ حلق کے پار نہ جائے۔
یہ ادنیٰ ناخن تک شاید بڑھتے بڑھتے
جال بچھائیں۔
گیان نگر بے حد دل کش ہے
لیکن اس کے رستے میں جو خار پڑے ہیں
کون ہٹائے؟

صدیوں کی سوچوں کا مرقّع
ٹوٹے ہوئے اس بُت کو دیکھو،
ہرے بھرے خود رو سبزے نے گھیر رکھا ہے،
فرقِ کشادہ سے چڑیوں کی یاد دہانی،
چاہِ ذقن پہ کائی جمی ہے،
ہوسکتا ہے شاید اس کو گیان ملا ہو
ہوسکتا ہے!

پیرس
۲/ جولائی ۸۴ء

اُلفت

تُو مرے پاس رہے، میں تری اُلفت میں فنا
جیسے انگاروں پہ چھینٹوں سے دھواں،
بنتِ مہتاب کو ہالے میں لیے،
تُو فروزاں ہو مگر ساری تپش میری ہو!

پھیلے افلاک میں بے سمت سفر،
ساتھ میں وقت کا رہوار لیے،
جس طرف موجِ تمنّا کہہ دے،
جستجو شوق کا پتوار لیے۔

گفتگو ربط کے احساس سے دور،
خامشی رنجِ مکافات سے دور،
چاندنی کی کبھی سرگوشی سی
پھول کے نرم لبوں کو چومے،
گردِ اندیشہ کو شبنم دھودے،
قہقہے پھوٹیں تامّل کے بغیر،

نور ابلے کبھی فواروں میں
اور نقطے میں سمٹ آئے کبھی،
تہہ بہ تہہ کھولے ردا ظلمت کی
اپنی بے باک نگاہوں سے منوّر کردے۔

نقطۂ وصل، یہ مٹتا ہوا دھبّہ ہی سہی،
ہوش بہتا ہے تو بہہ جانے دے
تُو مرے پاس رہے میں تری اُلفت میں فنا!

پیرس
۲ / جولائی ۸۴ء

تگ و دو مسلسل

یہ خاموش، مشغول اپنی لگن میں
بصد عاجزی اپنی پستی میں خوش ہے!
عقیدت کا ہدیہ لیے روز آتی ہیں
مغرور کہسار و پُر کیف وادی سے
تحفے سنبھالے ہوئے ندیاں،
یہ بے جا تلاطُم کو قابو میں رکھ کر،
بصد عاجزی اپنی جرأت سے خوش ہے۔

یہ دن رات کے اس تماشے سے خوش ہے......
یہ لہریں اُبھرتی ہیں
خود کو پٹک کر،
نشان اک لگا کر،
نئے عزم سے تُند ریلے میں آ کر،
مصمّم ارادے سے،
یک جا عزائم سے
پھر لوٹتی ہیں،
کناروں کو کھاتی، رگوں میں سماتی،
محبّت سے بنیاد کو چاٹتی ہیں۔

پھر اک سرد لمحہ......
تناور شجر اپنے سائے پہ گرتا ہے......
آغوش بڑھتی ہے،
بڑھ کر تھپکتی ہے،
کچھ دیر کو لوریاں تیز ہوتی ہیں،
لہریں اُبھرتی ہیں
یک جا عزائم سے پھر لوٹتی ہیں،
تگ و دو مسلسل۔۔۔

یہ دن رات کے اس تماشے سے خوش ہے......
مکمل یقیں ہے
تگ و دو مسلسل مسلسل رہے گی،
نشان اک لگانا،
پلٹنا، پلٹ کر،
نئے عزم سے تُند ریلوں میں آنا،
یہ لہریں ہیں یا لوریاں ہیں ابد کی!

پیرس
۲؍جولائی ۸۴ء

ہمسفری

دو صدیاں کیسے بات کریں،
سکھیاں بن جائیں،
ساتھ چلیں،
آکاش سے پھیلی دھرتی تک
شیشے کی اک دیوار کھنچی......
کیا رمز ہے، کیسا لہجہ ہے؟
کیا خبریں ہیں، کیا قصّہ ہے؟
اب ہاتھ ہلائیں، مُسکائیں،
سرگوشی ہو، یا چلّائیں،
اب سر ٹکرائیں، پھولوں کی سوغات لیے،
کیا بات بنے؟
دو صدیاں کیسے بات کریں؟
انکار سراسر ناممکن،
اقرار مکمّل بے معنی
اب سات سمندر شیشے کی دیوار سے لگ کر
جھانک رہا ہے،
گھور رہا ہے،
جھنجھلاہٹ کا گھٹتا، بڑھتا پاگل پن!

پیرس، ۱۴؍ جولائی ۸۴ء

پارک دے سیں کُلو ٥

بھرے ستاروں کے لہکے رنگوں کا کام پہنے
بہار آئی!
بہار آئی، شریر جھونکے،
شریر جھونکے لجائے غنچوں کی بھینی خوشبو سے
مست بھونروں کی آرزوئیں جگا رہے ہیں۔
گھنیری محراب میں درختوں کی
راستے سوتے جاگتے ہیں،
پروں کو پھیلائے فاختائیں
غبارِ سرما کی کلفتیں دور کر رہی ہیں،
گداز بانہیں مجسّموں کی
ہمکتے جھرنوں کے ٹھنڈے چھینٹوں سے
دھوپ کی چاشنی کی لذّت نکھارتی ہیں۔

کہیں کسی دھوپ چھاؤں گوشے میں،
دھیمی لوری کے دوش پہ،
خواب راز وادی میں
طفلِ معصوم کی خفی مسکراہٹیں
مامتا کے دل میں قرار بن کر اُتر رہی ہیں۔

سرکتے لمحوں کی اوڑھنی میں
بہار مچلی،
امیدِ فردا کا وعدہ کرکے
کلائی کھینچی،
تو نقرئی چوڑیوں کی چھن چھن فضا میں بکھری
اک ایسے سچ کی پھوار برسی،
کہ جس کی لذّت
خلش بڑھا کر،
خلش جو امروز و دوش و فردا کو اک تسلسل میں ٹانکتی ہے،
ہمیشگی کی جھلک دکھا کر،
حیات اور موت، بود و نابود کی تمیزیں مٹا رہی ہے۔

پیرس
۲۳ر جولائی ۸۴ء

٥۔ Parc de Saint Cloud جسے پارک دے سیں گلو پڑھا جاتا ہے۔

مِلّی ترانہ

ساربان، ساربان......!
ساربان کھو گئے کہاں
کہاں!

ریت، تہہ بہ تہہ،
پہاڑ جھکّڑوں میں،
چلچلاتی دھوپ گہری شام میں بدل گئی ہے،
ریت آنکھ میں، لباس میں، بدن میں، روح میں اُتر گئی ہے،
ساربان، خیمے اُڑ گئے طنابیں توڑ کر،
پکار،
چیخ،
دائروں میں بھاگتے ہیں، بے مہار،
ساربان......!
ساربارن کھو گئے کہاں!

ہم یہ پہلے دن سے جانتے تھے،
مانتے تھے،
راستے کٹھن ہیں، فاصلوں کی انتہا نہیں،
صلہ ہیں اپنا آپ آزمائشیں!

مگر تمہیں تو سَمت کا پتہ تھا،
ہم یہ جانتے تھے،
مانتے تھے،
چاہتے تھے،
سار بان......!
سار بان کھو گئے کہاں!
چلے تھے رات کی سیاہ چادروں کو تان کر،
سروں پہ آفتاب دن میں تیر سا برس رہا تھا،
بے گیاہ ریگ زار، جلتی پیاس میں کہیں نہ رُک سکے تھے،
اب تو، دشمنوں کے مخبروں کی ٹولیاں اُچاٹ ہو کے جا چکی ہیں،
سار بان......!
سار بان کھو گئے کہاں!

سار بان!
شہر منتظر ہے،
شائقین آس میں گلی گلی سجا رہے ہیں،
انتظار میں بشارتوں کی
شاہراہ پر ہجوم در ہجوم،
سار بان!
سار بان کھو گئے کہاں!

پیرس
۲/اگست ۸۴ء

گِردو پیش میں بکھرا بکھرا

دھیما دھیما چاند تھا
آدھی رات کی چُپ چُپ سرد ہوا
شہر سے بچ کر، بھیڑ سے کٹ کر،
دھندلے دھندلے سایوں میں،
ریت کے ٹیلوں کے دامن میں
کیکر کا اک دھبّہ سا،
سر پہ اکیلا سایہ تھا۔

چھپتے، بڑھتے، تیز قدم سے
چند جیالے آئے تھے:
"مال لٹاؤں، جان گنواؤں
تیری حفاظت میری ہے"
کیسی کشش تھی......
کس کی جھلک تھی......
کیسا نشہ تھا......
کیسی تڑپ!

مجھ کو رات کی تاریکی میں
سحر آگیں تاریخ کے دھندلے قصّوں میں،

صحرا کی تنہائی میں، یا
جنگل کے اک خوابیدہ سے گوشے ہی میں
قید نہ کر۔

جُز کی تمنّا کُل کا احاطہ
اور میں لامحدود، گریزاں،
ہر تخیئل کی، ہر بے انت کی، ہر معلوم کی، لامعلوم کی وسعت
ہر تنہائی کی تنہائی،
ہر خاموشی کی گہرائی،
ہر جامد میں مضمر حرکت،
حرکت میں پوشیدہ رکاوٹ،
جھلکی جھلکی پردے، پردے
گردوپیش میں بکھرا بکھرا!

سچ کے رسیا گر سورج کی ایک کرن سے
اپنی ترستی آنکھوں کی پاتال سجائیں
دیکھیں پھر کیا دیکھ سکیں گے!
جن آنکھوں کی ساری بصارت
ایک کرن ہی غارت کردے
وہ آفاقی سچ کے موتی
کِس قالب کے کس گوشے میں سینچ سکیں گی!

پیرس
۱۴ راگست ۸۴ء

انقلابی

وہ گر آج موجود ہوتا
تو مجھ سے یہ کہتا......
کہ میں انقلابی تھا،
تیری رسا چشمِ بینا نے دیکھی
ہے جھلکی مری روح کی۔

آج تو بُت کدے
اور بھی بھر گئے،
آج وہ بُت شکن ہم میں موجود ہوتا،
تو اُس کی روایت کی تقلید میں
ہم نے جو بُت تراشے ہیں اُس کے لیے،
اُن کو خود توڑتا۔

آج وہ بُت شکن ہم میں موجود ہوتا
تو منبر سے پُر زور اعلان کرتا کہ
''میرے خیالوں کی تعبیر
جامد سے، ساکن سے خود کو بچاتی ہوئی
اپنی شکلیں بدلتی رہے گی،
یہ جامد ہوئی گر تو دم توڑ دے گی۔''

پیرس ۱۶/اگست ۸۴ء

پاگل

تو جو ہمک کر میری گود میں چڑھ جاتی ہے،
راتوں کو بے موقع نیند اُڑا دیتی ہے،
تیری خاطر......
شعراء کے بازاروں تک میں ہو آتا ہوں
پھر بے سمجھی واہ واہ کے آوازے سے گھائل ہو کر
اکثر معافی مانگ چکا ہوں!

اے داد و تحسین کی خواہش!
ہیروں کا تو کام ہے آنکھیں خیرہ کرنا
پر ان ہیروں کی تخلیق میں
اور پہچان کے دَرجوں کی ترویج میں
لمبا وقفہ ہے......
کون یہ جانے
یہ کتنا لمبا وقفہ ہے!

اے داد و تحسین کی خواہش!
فرد جماعت سے گر دُور نکل جاتا ہے
تو پاگل ہی کہلاتا ہے!

پیرس، ۱۸/اگست ۸۴ء

دُو بدو

شکست آ!
میں دیکھ لوں!

عَقَب میں کوہسار،
چوٹیاں بلند، جن کو
یخ زدہ ہوائیں چاٹتی ہیں،
کاٹتی ہیں،
سامنے عمیق بحر،
آب کی چٹان بن کے ٹُوٹتا ہے،
اس جگہ،
یہ تنگ سی ترائی،
سرسراتی ریت بہہ رہی ہے،
بحر میں اُتر رہی ہے،
آ، بتا وہ کون تھا؟

وہ کون تھا، میں جس کے خوف سے جلا وطن ہوا،
محبتوں، رِفاقتوں کے نرم واسطے کٹے،
جڑیں جڑیں اُکھڑ گئیں؟
وہ کون تھا جو شہر، شہر،
شہر کی گلی گلی،

گلی گلی کے موڑ پر،
مکان در مکان،
سایہ سایہ جھانکتا تھا، کون تھا؟
وہ کون تھا، مری زبان خَلوتوں میں روکتا،
شگفتہ محفلوں میں سرسراتا خوف رینگتا،
شباب کی سپردگی میں خواب کے کواڑ کھول کر جگاتا، کون تھا؟

شکست آ،
یہ ڈھال، یہ تُفنگ، خود،
تیر، یہ کمان، سب
یہ تیرے سامنے یہاں زمیں پہ ہیں۔
میں اپنے سب نقاب پھینکتا ہوں تیرے سامنے،
شکست آ...... قدم جما
تو اپنا سارا زور سب گھمنڈ لا!

عقب میں کوہسار،
سامنے عمیق بحر،
پھر بھی آ، میں دیکھ لوں
وہ کون ہے جو عمر بھر
خوف میں چھپا رہا،
وہ کون ہے مقابلے کا
جس کو حوصلہ نہ تھا!

پیرس، ۶/ستمبر ۸۴ء

وہ بات

وہ بات گئی......

اب رات،

بھری برسات،

برستی جھڑی کی ٹپ ٹپ

راگ نہیں

جو اور لپٹ کر سُنیں،

معمّے، بھید

لبوں کے پھول

مچل کے کِھلیں،

لہکتی آگ پہ

ٹھنڈی برف

نشیلے کھیل میں

پہروں کٹیں۔

اب چاند کی چھم چھم لہر،

چمکتے شوق

اُمڈتے سیل کا نشہ نہیں

کہ جس کی کھوج میں

سوکھی ریت پہ

مِیلوں
رات گئے تک چلیں!

اب خوف،
پریشاں زُلف،
درو دیوار پہ
لرزاں سائے
میں جیسے رینگ رہا ہے،
عمر گزر گئی جاناں!

پیرس
۱۰ نومبر ۸۴ء

پیرس ا۔ ملاقات:۱

یہ خواب آ گیں گلیاں
یہ خواب آ گیں گلیاں

یہ کہروں میں ڈوبا ہوا سینؔ بہتا،
مغنی کا جادو، مصوّر کا تحفہ،
یہ خوابیدہ مرمر میں کندہ فسانے،
نگاہوں میں آ جائیں بیتے زمانے،
یہ رنگوں کی رِم جِھم میں سائے گریزاں،
بصد ناز کھلتے ہوئے گل عذاراں،
ہر اک موڑ جیسے خمِ کوئے جاناں،
یہ صبحِ بہاراں، یہ شامِ غزالاں،
میں ان کے تجسّس میں برسوں چلا ہوں!

یہ دو رویا پیڑوں میں شاداب رستے،
یہ خوشبو کے دریا، یہ پھولوں کے تختے،
نشیلی ہواؤں پہ نغمات بہتے،
کہ پہلی محبّت میں دو دل دھڑکتے،
میں ان کے تجسّس میں برسوں چلا ہوں،
چلا ہوں، گرا ہوں، گرا ہوں، بڑھا ہوں

اب اپنی امیدوں کی لڑیاں پروتا
تری ایک آواز پہ آ گیا ہوں!

پیرس
۱۱ر ستمبر ۸۵ء

پیرس ۲ ۔ملاقات : ۲

پیرس، پیرس......خواب کے دریا،
تیری چاہت کے چرنوں میں
فن کے جوگ میں پھرنے والے
من کی پیاس بجھانے آئے۔
تیرے آنچل کے سائے میں
روح کی ان مٹ بے چینی کو،
جنم جنم کی حیرانی کو،
رنگ وصوت وسنگ وغنا میں
ڈھالنے آئے!

پیرس، پیرس......خواب کی گلیاں،
مدھر ہوا، آوارہ خوشبو،
سیّن کا ٹھہرا ٹھہرا جادو،
الّھڑ رستے، میلوں میلوں،
دورویا پیڑوں سے کھیلیں،
مرمر کے اصنام کی آنکھیں،
پھولوں کی چلمن سے جھانکیں۔

جھلمل جھلمل قندیلوں میں،
اِک بے نام خلش سی، جس نے
میرے پاؤں میں گردش لکھی،
یوں لگتا ہے جیسے اچانک،
بس اس اگلے موڑ پہ آ کر،
میری آنکھوں کو موندے گی!

پیرس
۱۰ر ستمبر ۸۵ء

پیرس ۳: واپسی

اور کچھ دیر میں ڈھل جائے گی شام
تیرے ماتھے پہ دمکتا ہوا چاند اُبھرے گا،
سین کے لہروں کی رعنائیاں بڑھ جائیں گی
خواب گوں راہوں میں بے ساختہ انگڑائی کے ساتھ،
آرزوؤں کے چراغ
موتیوں کی طرح فانوسوں میں جاگ اُٹھیں گے،
جن کے دامن میں جواں جسموں کے مدغم سائے،
نکہت شام میں نہلائے ہوئے،
رقص خانوں سے اُبھرتی لے پر،
جام و مینا کی گزرگاہوں سے،
اپنے جذبات کو گرمائیں گے۔
پر اسی گوشۂ فردوسِ بریں میں کوئی آزردہ مکیں......
اے مرے خواب کے شہر!

اے مرے خواب کے شہر!
لوٹ جانے کے لیے،
پاؤں اُٹھتے ہیں مگر
جانے کس دل سے کوئی کیا جانے!
اشک آنکھوں سے رواں،

تیری تصویر ہے لرزاں جس میں،
تیری شمعیں، ترے شاداب شجر،
مرمریں سنگ کے گویا اصنام،
عظمتِ رفتہ کے بے خواب نشاں،
تیرے رومان کا جادو، ترے دریا کا سکوت،
ترے نغمے، ترے رنگ
ترے سورج، ترے تارے، ترے چاند
سب کے سب جیسے بہے جاتے ہو،
اے مرے خواب کے شہر!

مجھ سے مت روٹھ...... مرے خواب کے شہر،
پاؤں اُٹھتے ہیں مگر
ایک بے نام خلش چاٹ رہی ہے دل کو،
جیسے بے جان کئے دیتا ہو،
یاد کے نیش کا زہر،
اے مرے خواب کے شہر،
پھر تجھے دیکھ لوں رُک کر، پل بھر،
مجھ سے مت روٹھ، مرے خواب کے شہر!

پیرس
۱۵/ستمبر ۸۵ء

جنوبی افریقہ ا: برسات

ان گورے چٹّے ناموں میں اک کالا کالا نام
ان گورے گورے ہاتھوں میں اک کالا کالا جام
ان اُجلے سیمیں کپڑوں پر ایک گہرا کالا داغ
اُس کالے خون کا چھینٹا جو
صدیوں سے بکتا آیا ہے،
محلوں کے جلتے سایوں میں،
دن کے روشن اندھیاروں میں،
جگ مگ بازار کے پیالوں میں
بے داموں کا بے نام!
اک کالا کالا نام!

یہ پیالے اُبلے پڑتے ہیں،
اک کالے خون کا چھینٹا، یا
آمد آمد برساتوں کی،
آمد آمد برساتوں کی!

برسلز
۱۱/اکتوبر ۸۵ء

جنوبی افریقہ ۲: مساوات

نقیب ہم برابری کے،
آشتی کے،
دیکھیئے ......
لکیر ہم نے کھینچ دی ہے
ہم اِدھر، وہ اُس طرف
ایک بیش، ایک کم
کم میں گویا خون کم،
طفل ہیں معصوم کم،
مرد وہ غیرت فروش،
ناریوں میں لاج کم،
آسماں بھی خندہ زن
یہ نقیبِ آشتی!

پیرس
۷ رنومبر ۸۵ء

یہ کہاں جائیں گے؟

معجزہ تھا عجب......
آہنی چھنچھناہٹ سے زنجیر خود اپنے قدموں میں آ کر گری،
بھاری بھرکم دہانے کُھلے
اور چرخ چوں کی فریاد کے ساتھ،
پٹڑی پر ڈبّے سرکنے لگے۔
صبح کی دودھیا چھاؤں میں
آنکھ ملتے ہوئے سب یہ حیرت زدہ دیکھتے تھے
کوئی کھینچنے والا انجن نہ تھا!

اور ترائی اُترتی گئی،
ان کی رفتار بڑھتی گئی،
خار وخس کو کچلتی ہوئی،
تیز سے تیز تر،
تیز تر، تیز تر!

اب یہ پٹڑی جہاں ان کو لے جائے
جائیں گے،
اب یہ مسافر
جو اس فضلِ ربیّ پہ نازاں تھے،

حیراں ہیں،
مشکوک نظروں سے
اک دوسرے سے گریزاں سے،
وہموں کو دل میں چھپائے ہوئے،
تیز رفتار، بڑھتے چلے جائیں گے،
یہ کہاں جائیں گے!

پیرس
۲۷/اکتوبر ۸۵ء

سینہ بہ سینہ

دعا تو یہ ہے......
یہ بھولی بھالی شریر آنکھیں،
یہ جستجو سے بھری نگاہیں
نئے منازل کے راستوں کا سراغ لائیں،
دعا تو یہ ہے کہ ان کے رستوں میں نور کھیلے!

جہالتوں کی وراثتوں کے نقیب ہم تم،
گداز ذہنوں کو کیا سکھائیں؟
وہ علم ہم جس سے نابلد ہیں،
تمام تر جس کی ہم نفی ہیں،
وہ نظم ہم جس سے بے خبر ہیں،
وہ قول ہم جس کی ضد رہے ہیں،
وہ شوق ہم جس کے نوحہ گر ہیں؟
دعا تو یہ تھی!

پیرس

۱؍نومبر ۸۵ء

مشغول

نفع یہ ہے
وہ زیاں،
یہ زمین وہ مکاں،
اس کو بیچ، وہ اُٹھا،
اس سے پوچھ
اُس سے بات
سَر سلام!
سالِ نو کی تہنیت صدائے عام!
محفلوں،
ضیافتوں،
سفارتوں میں
اپنے نام کو اُچھالتے رہو!

پیرس
۸ر نومبر ۸۵ء

سچ؟

ازل سے اس کی سلطنت کو کوئی مانتا نہیں،
جو دل میں آ کے جھانک لے تو جیسے جانتا نہیں،
پر اب تو مان...... جھوٹ کی نفی نہ کر،
نفی نہ کر، کہ جھوٹ ہے
سچ کی ساری سلطنت کا واسطہ!

نفی نہ کر، کہ جھوٹ ہے
نُطق پر، خطاب میں،
آب و خاک و باد میں
معاملے، مکالمے، تکلّفات و حادثے
میں دوست، یار، مہرباں۔

کھیت کھیت رینگتا ہے جھوٹ بہتے آب میں،
سینچتا ہے نور جھوٹ شہر کے مکان میں،
بھاگتا ہے تیز تیز جھوٹ تیز کار میں۔

جھوٹ کالے حرف کی بلند بانگ سرخیاں،
جھوٹ عہدِ کہنہ کی دبیز لن ترانیاں،
جھوٹ اس لیے کہ سچ کا دُور تک پتہ نہیں،
[یہ تیرا صرف وہم ہے، میں سچ سے بدگماں نہیں]
ہر اک نقیب سچ کا لہکے جھوٹ کے الاؤ میں
گماں کو خشت کرکے سچ کی نیو ڈالتا رہا ہے۔
جھوٹ کی نفی نہ کر......
کہ سچ کی دودھیا لکیر دُور جھلملا سکے!

پیرس
۸ر فروری ۸٦ء

تلاش

اب ہم اپنے شہر کی گلیاں کن لوگوں کے نام کریں؟
پہلے اکثر نام پتے افرنگی تھے،
چند شہیدوں کے کتبے،
بھولی بسری صدیوں سے بھی نام چُنے،
پھر اسلامی شہزادوں نے دان دیا،
دان کی خاطر ہم نے اپنا مان دیا!

اب تو ایسی جنگ چھڑی ہے،
سارے شہید اور سارے غازی،
سارے کافر، سارے نمازی،
سب ہی اپنے دشمن ہیں۔

اب ہم اپنے شہر کی گلیاں کن لوگوں کے نام کریں
کن لوگوں سے بھیک ملے گی
کن لوگوں کو رام کریں!

پیرس
۸ر فروری ۸٦ء

تہمت

چلو پھاڑ دیں اس کلینڈر کو
یہ جھوٹ ہے!
''مجھ پہ تہمت لگاتے ہو میں ایک ہی سمت میں قید ہوں؟
لوٹ جائیں قدم میرے، ممکن نہیں؟''

آج اس وقت، اس ایک ساعت میں، مَیں
آنے والی صدی کی شعاعوں سے ایسا منوّر رہوں
[اُن کی نگاہوں میں جو کل کی تیاریوں میں لگے ہیں]
کہ جیسے کسی آفتابی تمازت نے مجھ کو جلایا ہو، مَیں
بیتی صدیوں میں اس وقت یوں گھومتا ہوں
[روایات میں غرق پھیلے ہوئے مشرقی ارض پر]
جیسے فردا و دیروز مجھ میں بیک وقت زندہ رہے ہوں
میں دوسمت میں آج بھی چل رہا ہوں!

پیرس
۱۰ فروری ۸۶ء

قیدی

سر پہ سنبھالے رُتبے کا مَن وزنی خَود،
عِلم کے بھاری آہن میں تن بکتر بند،
ڈھال میں چاندی کی جھنکار،
ہاتھ میں آبا کی تلوار،
آیا تھا کرنے یلغار!

برسوں برسوں ڈھونڈ چکا، اب
جنگ کہاں، کیسے اغیار،
دُھند بھرا سناٹا، جیسے
ذہن پہ اَن دیکھی دیوار
سونے کے پنجرے میں دیکھا
گم صُم اک پنچھی لاچار!

دُور فضا میں دھواں دھواں سا
پھیل رہا ہے ایک سوال
تیرا ذہن تو بس تیرا ہے،
کس نے اس کو قید کیا ہے؟

پیرس
۱۱ر فروری ۸۶ء

فقیروں کی بستی

یہ خیرات ہی کی کرامت ہے.....آقا!
یہ پردے ہٹادے،
بڑے بادشاہوں کی سنگت ہے،
سالانہ خیرات کا معاملہ ہے،
تو تمغے سجا، میرے آقا، تری حاضری ہے
...... وہ تمغے جو مشرق کے ملبوس پر طنز ہیں......
وہ تمغے جہادوں کے، جن کے پتے جیل خانوں میں فریاد خواں ہیں،
وہ جنگیں نشاں جن کے سرحد کے اندر کہیں دفن ہیں!

یہ خیرات ہی کی کرامت ہے
اُترن سے مانوس ماحول میں
رِیت ایسی چلی ہے کہ ہر مرحلے، فکر میں،
صرف ''امداد'' ''امداد'' کی گڑ گڑاتی صدا ہے
ہر اک فرد خیرات کے شوق میں سرگراں ہے۔
یہ پردے ہٹا میرے آقا
کہ تُو بھی فقیر اور مَیں بھی!

پیرس
۱۲ ؍ فروری ۸۶ء

حاکم

''اپنی تصویر بنا!
ذہن کے خاکے کو کاغذ پہ اُتار،
کونوں کھدروں میں، جسے
گرد کی تہہ میں چھپا رکھا ہے،
اک نظر دیکھ تو لے،
اپنی تصویر بنا!''

''کون سے رنگ بھروں؟
گرم، جذبات سے لپکے ہوئے رنگ،
یاس و تسکیں کا شفق رنگ ملاپ،
وہم کے دودھیا گدلائے رنگ،
خوف آنکھوں میں، کہ حسرت، کہ پشیمانی ہو
یا کہ جینے کی جواں تاب امنگ؟
میرے آقا، میرے مالک تیری پہچان نہیں!''

''مہرباں دوست سے، ماحول سے، ماضی سے نہ پوچھ،
آئینے ان سے نہ پوچھ
عکسِ دریا میں تو ظاہر ہی نظر آئے گا،
یہ تو وہ دیکھیں گے جن کے یہ پرستار یا بیمار رہے،

آج جو ذہن میں خاکہ ہے وہ کاغذ پہ اُتار!
عین ممکن ہے کہ وہ رنگ ملیں......
تیرا ظاہر ترے باطن سے ہم آہنگ رہے،
ہاں تو اس خاکے کو پھر ذہن کے تاریک نہاں خانوں میں
جشن و اعزاز سے دفنا دینا،
تا کہ پھر اس کی حکومت کا نیا دور چلے!''

پیرس
۱۵/فروری ۸۶ء

پہچان ۔ ۱

ہم تمہیں جانتے ہیں،
ہر اک لفظ،
ہر مدّ عا،
ہر اشارے کو پہچانتے ہیں،
محبّت سے،
نفرت سے،
سبقت، عداوت کے رشتے سے،
شبہات سے،
ہم تمہیں خوب پہچانتے ہیں
مگر، کاش، خود کو بھی پہچان لیتے!

پیرس
۱۵/فروری ۸۶ء

دامن کشاں

ہر اک گام پر،
ایک مدّھم سی آواز کہتی ہے
یہ راستہ،
جانا پہچانا، پُرکھوں کا چھانا ہوا راستہ،
جانے پہچانے رستے کی آسانیاں،
ان میں بے جا تحفّظ، حضر کی تمنا ہے،
تقلید کا دامِ زنجیر ہے!

اپنے پُرکھوں کے چھانے ہوئے راستے،
جن پہ آباؤ اجداد چلتے ہوئے،
ایک منزل پہ قرنوں سے قائم رہے،
ان سے بچ کر گزر!

پیرس
۱۵ فروری ۸۶ء

آگ کی پیاس

میں آگ بھی تھا اور پیاسا بھی،
تو موم تھی اور گنگا جل بھی،
میں لپٹ لپٹ کر
بھڑک بھڑک کر،
پیاس بجھاتی آنکھوں میں بُجھ جاتا تھا۔

وہ آنکھیں سپنے والی سی،
سپنا جس میں اک بستی تھی،
بستی کا چھوٹا سا پُل تھا،
سوئے سوئے دریا کے سنگ،
پیڑوں کا میلوں سایہ تھا
پُل کے نیچے اکثر گھنٹوں
اک چاند پگھلتے دیکھا تھا!

اب یاد میں پگھلی آگ بھی ہے،
آنکھوں میں بہتا پانی بھی،
میں آگ بھی تھا اور پیاسا بھی!

پیرس
۲۶/فروری ۸۶ء

علم کے فاصلے ۔ ۱

سب اُسے پہچانتے ہیں،
سب کو وہ معلوم ہے،
باخبر ہیں اُس کی بابت کس قدر
وہ جو نامعلوم ہے!

گفتگو کا شوق بھی ہے
تم سے قُربت کی مری خواہش بھی ہے،
ایسی کچھ باتیں کرو،
کچھ مجھے بھی علم ہو،
پھر مبادا گفتگو ہم کرسکیں
علم کے یہ فاصلے کم کرسکیں!

پیرس
۷؍ مارچ ۸۶ء

علم کے فاصلے ۔ ۲

اگر میں تمہیں یہ کہوں......
کہ تم بے ضرر، بے اثر، بے ثمر ہو،
تمہیں گر یقیں ہو کہ یہ جھوٹ ہے
تو مجھے ہنس کے تم ٹال دو گے!

اگر میں کہوں
کہ تمہارا ''خدا''
بے ضرر،
بے اثر،
بے ثمر ہے
تو تم میری گردن کا خوں چوس لو گے!

تمہارا کہ میرا،
''خدا''، ''ناخدا'' تو وہی ہے،
مگر اس تصوّر کے آدرش میں
اور تم میں بڑا فاصلہ ہے!

پیرس
۹/ مارچ ۸۶ء

ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

وہ چارہ گرانِ دشتِ وفا
جو خواب میں جنگیں لڑتے ہیں
اُس سُکھ کے گیت سناتے ہیں
جو غفلت کی مدہوشی میں
اک خواب سا بن کر آتا ہے
دن کے مجروح خلاؤں میں
آنسو بن کر کھو جاتا ہے!

اب خواب کی جنگیں ختم ہوئیں،
اب بازی پلٹی، آنکھ کُھلی،
اب سُکھ کے بہت نغمے گائے
لائے گا جو کل کا دن، لائے!

اب پہنچیں گے ہم گلی گلی
خوابوں کی حسیں وادی سے پرے،
اب گھر گھر دستک دیں گے ہم،
اک عزم کا تحفہ ساتھ لیے
بوسیدہ، ٹوٹے کمروں میں
تدریس کی لو سلگائیں گے

اب بھوک کے لپکے شعلوں کو
اک وقت کی روٹی لائیں گے،
بستی کی مچلتی فصلوں پر
ہے نام رقم، دکھلائیں گے!

پیرس

۱۵/ مارچ ۸٦ء

وِجدان

یہ کھیل گڑیوں کے،
ریت محلوں کے،
پیڑ پتھر پہ نام لکھنے کے،
تیز سبقت کے،
پیش و پس کے،
جو سوچیے تو ہنسی بھی آئے۔

مدارِ حسرت بکھر رہا ہے،
بدن کا کانسہ پگھل رہا ہے،
یہ روح بے باک پھر رہی ہے......
تمام تر جستجو کی دھڑکن،
تمام تر آرزو کا ایندھن،
کہیں کسی سے الجھ رہی ہے
......تو اپنی ساری تپش میں اس کو جلا رہی ہے،
گلے کسی کو لگا لیا
......تو سپردگی کے عروج پر جھلملا رہی ہے،
مرے پگھلتے ہوئے بدن کو
نئی خبر لا کے دے رہی ہے۔

پیرس ۱۷/ مارچ ۸۶ء

ساتھ ساتھ

کبھی یہ تتلی، گُلوں کو چُنتی،
کبھی یہ سرپٹ لگام سے بے نیاز گھوڑا،
کبھی یہ دریا، سپاٹ میدان، رینگتا سا،
کبھی یہ کہسار کلغیوں پر قدم جماتا،
کبھی یہ غاروں میں دفن یادیں کُریدتا سا
کبھی یہ سرکش، روایتوں کے بُتوں سے لڑتا،
سحر کی پہلی کرن سے شبنم کو جھلملاتا!

مرے تخیّل کو ساری آزادیاں مبارک
......مگر بیک وقت یہ نرم تتلی، یہ تیز ابلق......
کہیں ملے تو اسے بلاؤ
اسے یہ کہہ دو
جہاں بھی جائے مجھے بھی اب ساتھ لے کے جائے!

پیرس

۱۹ / مارچ ۸۶ء

پُرخطر سفر

وہ عریاں تضادات......
خود سے بھی سرگوشیوں میں کہیں،
گر کبھی آمنا سامنا ہو تو انکار کر دیں،
پُراسرار سرگوشیاں عام ہوں تو،
سماعت پہ بار گراں ہیں۔

سماعت کا یہ بوجھ
گر اجتماعی صدا بن کے پھوٹے،
پُراسرار خوشبو اڑے
اچانک کوئی اک پیمبر نئی روشنی لے کے آئے،
تو آنکھوں پہ، کانوں پہ پہرے بٹھائیں
صحیفے جلائیں۔

[مگر رفتہ رفتہ وہی لوگ
لبّیک، لبّیک کے شور و غوغا سے،
بے سمجھے بوجھے،
سمندر کی سفّاک لہروں کی تُندی سے آگے بڑھیں]

پُر اسرار خوشبو کا،
پھولوں سے اُڑنا،
فضا میں بکھرنا،
بکھرنے سے پہلے
سفر پرُخطر،
ایک لمبا سفر ہے!

پیرس
۲۲/ مارچ ۸۶ء

تتلی

گلشن گلشن رنگ برنگی امیدیں،
اندیشوں کے کالے بادل، تیز ہوا،
آتے جاتے نظاروں کے بہتے عکس،
یادوں، خوفوں، خوابوں کا بے انت سرا،
ہوش فقط کاہل دریا،
فائل کے انبار پہ دونوں ہاتھ دھرے،
تارِ نظر میں اُڑتی تتلی
دُور چمن میں غنچہ غنچہ ڈالی ڈالی چوم رہی ہے
اور کمرے میں لحظہ لحظہ
بڑھتے ہوئے سیلاب کی گہری خاموشی!

پیرس
۱۸/ مارچ ۸۶ء

خرید و فروخت

انہیں بیچنا تو ضروری ہے!
بازار کے موڑ پر
وقفہ وقفہ صدا
کیمیا مل گیا! کیمیا مل گیا!
وقفہ وقفہ صدا
ان صداؤں کا آہنگ
مسجد، شوالہ،
صحیفے،
صحیفوں کا آہنگ،
نغمات،
نغموں کا آہنگ
طبل و علم
فوج آہنگ پر مارچ کرتی ہوئی۔

انہیں بیچنا تو ضروری ہے، ورنہ
خیالات، نرگس زدہ،
اپنے ماحول کے غار میں بے نوا ہی رہیں گے
انہیں بیچنا تو ضروری ہے، ورنہ
کسی کیمیا گر کی تقلید کا زہر پینا پڑے گا
ہمیں تو خریدار بن کے ہی جینا پڑے گا!

پیرس، ۲۶/ مارچ ۸۶ء

تحفہ

کہاں سے آیا
یہ کس نے بھیجا،
یہ بند پیکٹ
نہ کوئی رقعہ
نہ درج فہرس
نہ کوئی قیمت۔

یہ نام میرا ہے، یا کوئی بھول ہوگئی ہے!
مذاق اس میں چھپا ہوا ہے کہ ایک نشتر،
یہ دُھندلے رستوں کا دستِ رہبر ہے
یا کہ بازی چُھپی ہوئی ہے
کہیں یہ اک فوج
اک اشارے کی منتظر ہے؟

یہ ایک تحفہ ہے، سوچنا کیا
نہیں یہ میرے لیے نہیں ہے،
یہ ایک تحفہ ہے قدرو قیمت کا مسئلہ کیا،
یہ کھیل کھیلوں؟
بساط اُلٹ دوں؟

بساط اُلٹ دوں تو پھر کوئی اور کھیل ہوگا؟
یہ کھیل ہے تو اسے ہی کھیلیں
یہ ایک تحفہ اسے اُٹھالیں!

پیرس

۲۸/ مارچ ۸۶ء

قربت سے دوری

وقت کی قلّت کے شکوے،
خودفراموشی کے جال:
تانے بانے فون کے،
پُرتکلف دعوتوں کا اہتمام
نت نئی مصروفیت،
سالانہ فرصت کے پلان،
در بدر سیّاح، تمغے دور دیسوں کے لیے
مستقل گُھڑ دوڑ، پیہم التوا انعام کا،
وقت خانوں میں، شکنجوں میں، بٹا۔
زنگ آلودہ دماغ......
سوچتا ہے تھک کے دن کی دوڑ سے
یوں گرے بستر پہ، فوراً سو سکے
یا سہارے کے لیے
ہلکا پھلکا سا کوئی ناول ملے،
جنس کی ورزش سہی،
کوئی حیلہ، کچھ بہانہ......
اپنی قربت سے ذرا دوری رہے،
سوچنے سے بچ سکے!

پیرس، ۶/اپریل ۸۶ء

لگان

بادشاہ مرچکا ہے
وارثین آئیں، اب بصد خلوص جنگ ہو
یہ تاج وتخت،
سلطنت،
لگان پچھلی کھیتیوں کا
کون لے گا،
خَلعتیں، وزارتیں
عطا کرے گا!

بے زباں عوام
کس کے نام پہ
دعا کریں گے، کھیتیاں خراج
کس کے نام پہ
اُگل سکیں گی،
منمناتے بھیڑ کے جلوس
کس کے نام پہ
بہ صد خلوص
فخر سے چلیں گے
قتل گاہ کو!

پیرس، ۱۶/اپریل ۸۶ء

ٹِک ٹِک

ٹِک ٹِک کرتی
ایک گھڑی کی
چابی ٹوٹی۔
بجلی روٹھی،
میرا کمپیوٹر بھی اب بے جان پڑا ہے،
یادیں جو اس وقت رواں تھیں،
کھو بیٹھا ہے۔

میں بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں،
اِس دم اُس کی روح کہاں ہے،
روزِ جزا کا دفتر کھولوں:
شیشے میں اک یاد سجا دوں،
یا کوُڑے میں پھینک کے
لپکے تنّوروں کی بھوک بجھاؤں؟
اب تو یہ بھی ممکن ہوگا،
چابی ہی کو ٹھیک کرا کے،
روح کو واپس لے کر آؤں؟

ٹِک ٹِک کرتی
ایک گھڑی کی
چابی ٹوٹی............
....
....

پیرس
۲۰/اپریل ۸۶ء

ظفر زیدی مرحوم کی تصویر دیکھ کر

ہونٹوں سے اک کرب نمایاں،
پہلے جسم کے پہلے لمس نے کڑوا میٹھا درد دیا ہے،
ذوقِ تجسّس، زخمِ تمنّا،
تہہ میں اُترتی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں،
اُن کے خالی پن سے گھائل

سوچ رہی ہیں،
کیا دنیا کے پاس یہی ہے!

بحراوقیانوس
۱۰رمئی ۸۶ء

آشنا سے

مری آشنا، مری مہرباں،
یہی قربتیں ہیں گنی چُنی
جو چُرا کے ہم نے سمیٹ لیں،
یہیں چھپ کے شہر کے درمیاں۔

مری آشنا، مری مہرباں
موئے تشنگی کی برہنگی
جو سلگتے ہجر میں جل اٹھی
مرے ریت ریت وجود پہ
تری زلف ابرِ سیہ بنی
دلِ شادماں سے دعا اُٹھی،
کہ دوام ہوتیں یہ ساعتیں۔

مری آشنا، مری مہرباں،
یہی چند لمحے گنے چنے،
تجھے دُکھ ہے ۔۔۔ کچھ تو نہ کہہ سکے،
نہ شکایتوں کی تھیں مہلتیں،
نہ روایتوں کو نبھا سکے،
تری خامشی تو عمیق تھی،

مگر ایک قطرہ گہر نما،
ترے کربِ جاں سے چھلک گیا،
مرے کوزہ ہائے خیال میں

جو گماں تھا تیرِ جگر بنا۔
مری آشنا، مری مہرباں
یہی رسم و راہ اگر بڑھے،
انہی قربتوں میں ہیں فاصلے
ابھی اپنے دام میں رکھ مجھے،
مری آشنا، مری مہرباں،
ابھی اتنا پیار نہ دے مجھے
کہ یہ موجِ سیلِ کرم ترا
یہ بہا نہ دے مرا آشیاں
مری آشنا، مری مہرباں!

ٹورنٹو
۱۰ رمئی ۸۶ء

پہچان ۔ ۲

عشق کر، جان دے
خود کو پہچان دے
یہ جو تحفہ ملا،
اس کو آنکھوں میں رکھ،
اس کو دل میں بٹھا،
اس کو بانہوں میں لے
اس کو جھولا جُھلا،
بادلوں سے پرے
دُور کی پینگ دے
عشق کر جان دے
خود کو پہچان دے۔

یہ جو پھولوں کی خوشبو دِوانی اُڑی،
لمسِ بادِ صبا میں اثر ساحری،
یہ جو آنکھوں میں قوسِ قزح جل اُٹھی،
کانچ کی جھنجھناہٹ میں چوڑی بجی،
سر پھری شاخ نے بڑھ کے آنچل لیا،
دیر تک تال میں دل کی دھڑکن بڑھی،
جھیل کی سطح پر مینہ کی چادر بچھی،

بلبلے پھوٹتے، بلبلے ٹوٹتے،
عشق کر جان دے
خود کو پہچان دے!

کھِلتے کھِلتے اچانک شگوفہ کھلے،
کونپلیں صبح دم برگِ صد ناز ہوں،
چاند یک بارگی پیڑ میں جا چھپے،
بھول آئے جسے، پھر ستانے لگے،
عشق کر جان دے
خود کو پہچان دے!

پیرس
۲۲رمئی ۸۶ء

ہمالہ

عجیب بیزار شخص ہے وہ،
اُسے عقیدت اذیتوں، آزمائشوں سے۔
وہ سر پہ دنیا کا بوجھ ڈالے،
روایتوں کے لیے حوالے،
تمام ہمّت بکف دیانت،
کنواں نیا روز کھودتا ہے،
پھر اس میں گرتا ہے،
گِر کے خود کو نکالنے کی مہم میں دن رات کاٹتا ہے
اسے محبّت ہے ذات کی گہری کھائیوں سے!

کمال حیرت ہے اس نے خود سے کبھی نہ پوچھا:
''یہ بوجھ کیسا اٹھا رکھا ہے
ہے اس اذیّت میں مصلحت کیا؟
قدم قدم خار دار رستے،
یہ دشت و دریا، یہ کوہساروں کے سلسلے سے،
یہ چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں [ایک پھول حد تک]
یہ لمحے لمحے کی مسکراہٹ کے منتظر لوگ [ہسپتالوں میں]

میری آنکھوں سے کیوں چھپے ہیں،
یہ میرے خوابوں سے دور کیوں ہیں
سلے ہوئے ان کے ہونٹ کیوں ہیں؟''

کمال حیرت ہے اس نے خود سے کبھی نہ پوچھا:
''کوئی صدا، سرفروش جذبہ،
کوئی ندا کیوں نہیں بلاتی؟''

اے دامِ کلفت کے بے ریا دائمی ستم کش،
میں منتظر ہوں
کبھی مجھے بھی تو آزما لے!

پیرس
۲۹ مئی ۸۶ء

نقش بر آب

نکل کے بستی سے،
بچ کے جنگل سے،
چند قدموں پہ سُست رفتار موجِ دریا سے ربط رکھتے
میں چل رہا تھا......
میں چل رہا تھا کہ گویا دریا ٹھہر گیا تھا
جمود حرکت میں گھل گیا تھا!

کتابِ باطن پہ ایک جھلکی،
سیاہ راتوں میں برق چمکی
اٹوٹ رشتوں کے شاخ در شاخ سلسلوں کو
بس ایک لمحے کو جگمگاتی
تڑپ کے گزری......
تو میں نے روکا......
ابھی تو دریا کے پار جانا ہے،
اِس سے ملنا ہے، اُس سے بچنا ہے،
پھر کبھی عمر کی خزاں میں
اٹوٹ رشتوں کے رابطوں کو کُرید لینا!

یہ خواب بستی سے بہہ کے
شہروں سے ہو کے
ملکوں کی سرحدوں سے گزر کے
ساگر میں مل چکا ہے۔
اِدھر میں برسوں سے دشت و وادی کے خار و خس سے الجھ کے آخر
بحیرۂ روم کے کنارے
تلاشِ فرصت میں آ گیا ہوں!

مگر یہاں تو......
طویل فرصت کی جستجو میں لُٹے ہوئے قافلے رُکے ہیں
زمین ان کو دھکیلتی ہے تو یہ سمندر کو بھاگتے ہیں
مگر ہر اک ٹوٹتی ہوئی لہر سے ہراساں
یہ تنگ ساحل پہ رک گئے ہیں۔
یہ ایک جنگل ہے......جس میں اجسام آفتابی تپش کی چاہت میں
گرم تانبے کا ڈھیر بن کر پڑے ہوئے ہیں،
یہ ایک جنگل ہے......جس میں بے چین آرزوئیں سلگ رہی ہیں،
تپش اگر حد سے بڑھ رہی ہے تو ٹھنڈے چھینٹوں سے آب دے کر
طلب کی حدّت بڑھا رہی ہیں،
وہ آرزوئیں...... جو شام ہوتے ہی دُھل دھلا کر
فضائے عطر و حنا میں بس کر
شراب خانے کے شور و غوغا میں اپنا اثبات چاہتی ہیں!

میں خشک ساحل پہ بہتے ساگر سے چند قدموں پہ آ گرا ہوں
میں اس سے اتنا قریب ہو کر بھی اس قدر دور ہو گیا ہوں
وہ ایک جھلکی کہیں کسی غار میں ابھی ٹمٹما رہی ہے!
تڑپ تڑپ کر یہ موج اُٹھتی ہے
موج اُٹھ اُٹھ کے کہہ رہی ہے:
"میں اس سمندر کا ایک جُز ہوں
میں اس سمندر کے ساتھ اُٹھتی، میں اس سمندر میں ڈوبتی ہوں
میں ڈوبتی ہوں تو ساری کاوش سے پھر اُبھرتی ہوں۔"
اس کی آواز، بہتے ساگر کو، اُٹھتی لہروں کو جیسے خوابوں میں سن رہا ہوں
میں اس کی خوشبو کو سونگھتا ہوں
فضا میں محسوس سی تراوٹ کو چاٹتا ہوں!

مونتاں
۲۳/اکتوبر ۸۶ء

مونتاں⁰

تھر تھر تھر سطحِ سمندر کانپ رہی ہے۔
دُور دُور سے اُٹھتا ریلا،
بڑھتا ریلا،
پھڑ پھڑ پھڑ پھڑ پر پھیلا کر
ایک تھپیڑا،
خشک چٹانوں سے ٹکرا کر،
دامن بھر کر
صدیوں کے تہہ خانے بھرنے کھو جاتا ہے!

گِن گِن گِن گِن سطحِ سمندر ڈول رہی ہے
دیکھیں تو، ہاں اس پھیرے میں کیا کیا پایا،
سَر سَر سَر سَر بحرِ مسرّت مسکاتا ہے
کیسے کیسے ہیرے موتی......
فرطِ طرب سے ہانپ رہا ہے!

تَھر تَھر تَھر سطحِ سمندر تھراتی ہے
کون ہے جو یہ ہیرے موتی
میرے تہہ خانوں سے لے کر واپس آئے؟

---

0 Menton, Cote d' Azure, France جسے ''مونتاں'' پڑھتے ہیں۔

پھڑ پھڑ پھڑ پھڑ پر پھیلائے
دُور دُور سے اُٹھتا ریلا
کس کی جرأت......
ایک تھپیڑا!

پیرس ۱۶/ا کتوبر ۸۶ء

آخری لو

ابھی چٹختے بندھنوں کے بند میں تناؤ ہے،
سوال دل میں اُٹھ رہے ہیں گولبوں پہ مُہر ہے،
عمارتیں جو ڈولتی ہیں وہ ابھی گریں نہیں
ابھی یقیں کی زرد لَو
بھڑک اُٹھی ہے آخری دفاع میں۔
دریدہ، پارسا قبا، ابھی بھی ڈھانپتی رہی ہے پھیلتے تضاد کو۔
جھجھک رہا ہے انتشار
وضع دار شرم میں،
ابھی عقابِ اضطراب
تھک کے اونگھتا رہا ہے وقفہ وقفہ یاس میں!

اُمڈ اُمڈ کے قافلے،
نکل کے گاؤں گاؤں سے
نواحِ شہر میں اُتر کے جانے کیوں ٹھہر گئے،

عمائدین شہر، کچھ پیام لے کے آ رہے ہیں
کیا پیام لا رہے ہیں...... اضطراب، جاگ! جاگ!
انتشار پھیل...... ذرّے ذرّے کو زبان دے،
چٹختے بندھنوں کو، نیم برہنہ تضاد کو
یقیں کی ٹوٹتی طناب، ڈولتے پڑاؤ کو،
بس ایک پھونک، ایک پھونک، ایک پھونک چاہیئے!

پیرس
۱۷/۱۰/اکتوبر ۸۶ء

تیز ذرا

دُور پہاڑوں سے لہراتی،
برف کے برچھی بھالے تانے،
گھائل کرتی، سَن سَن سَن سَن تیز ہوا
پتّے بکھرا!
دھرتی کے کونوں کُھدروں کی بات سمجھ
دُور دُور جا بیجوں کو گرمی پہنچا!

ہلتی دیواریں تو اب تک قائم ہیں،
پھٹے پرانے خیمے سر پر دائم ہیں،
اُترن میں اب جسم بہت ہی ننگے ہیں۔
رات کی تاریکی سے لڑتی
دیے کی لَو اب اور تڑپ کر بھڑکی ہے۔
سَن سَن سَن سَن تیز ہوا کے جھونکے آ!

رات کے گہرے سنّاٹے میں
ذرّہ ذرّہ چیخے گا،
آہ و بکا، گھائل چیخیں آسیب زدہ،
اندھی جنگیں خون خرابا تو ہوگا!

ایسے شور شرابے میں بھی کونوں کھدروں سے اٹھتا،
کونپل کونپل نغموں کا کومل پودا،
کہیں تو جا کر پیڑ لگیں گے، پھل ہوگا،
آہ! ......مگر لمبا وقفہ!
عمر کی مہلت کم ہے، آنکھیں کھول ذرا،
سَن سَن سَن سَن تیز ہوا، رفتار بڑھا!

پیرس
۱۹/نومبر ۸۶ء

سپردگی

وہ آ گئے پھر سوال والے
عصا و میزان کو سنبھالے
قضا و قدرت کا روپ دھارے
وہ آ گئے پھر حساب والے!

ادھر یہ معمول ہو گیا تھا
میں جوں ہی فرصت میں منہمک ہوں،
وہی فراغت کے مشغلے سب......
یہاں کی میخیں، وہاں پہ تصویر کی کجی کو درست کرنا،
کبھی ذخیروں کی تازہ فہرس میں اندراجی
...... وہ سارے نغمے،
وہ سارے گردِ سفر کے تمغے......
جو چیدہ چیدہ بہم کیے تھے۔
میں جب بھی فرصت میں منہمک تھا
کبھی وہ کھڑکی سے جھانکتے تھے،
مری توجّہ کو گُدگُداتے،
کبھی وہ کھل کُر صدا لگاتے
سوال والے!
میں دل میں کڑھتا ہوا اُٹھا، اور

لگایا انبار ان کے آگے
کھلونے ٹوٹے ہوئے جو بیکار ہو گئے تھے،
پرانے پاپوش......جن کا فیشن بدل چکا تھا،
قبائیں جو تنگ ہو گئی تھیں،
وہ کینچلی جو بدل چکے تھے،
وہ سارا ماضی جو بے ضرر تھا!

مگر وہ پھر بھی وہیں کھڑے تھے......سوال والے!
وہ نقد و زر مانگتے ہوں شاید؟
تو میں نے سوچا کہ خیر ہو گا،
کچھ اپنی نقدی بھی لا کے رکھ دی،
مگر وہاں تو......
نہ شادمانی کی کوئی جھلکی
نہ شکر و احساں کا شائبہ تھا!

اُنہیں مِرا وقت چاہیے ہو......؟
تو خوب...... لے کر جلوس نکلو،
چلو، میں نعروں میں ساتھ دوں گا!
نہیں......! وہ پھر منتظر کھڑے تھے!
وہ آج آئے تھے میرے فردا کا قرض لینے
وہ آج آئے تھے مجھ سے میرا وجود لینے!

پیرس، ۱۸/نومبر ۸۶ء

پیار کے تحفے

نہ جانے کیا مِلا، کیا حسرتیں باقی رہیں دل میں
ابھی دنیا سے کیا کچھ اور لینا ہے؟
مجھے تو یہ خبر ہے......
یہ دہکتی آگ
سب کچھ خاک کردے گی
فقط میرا نشاں
اُٹھتا دھواں
چاروں طرف رشتوں پہ میلی راکھ چھڑکا تا۔

یہ تیزابی،
رگ و پے میں پنپتا زہر،
مغرورانہ بیزاری،
کھڑی دیوار کرتی چار جانب قلع داری کی،
یہ سب اس آگ میں کیوں جل نہیں جاتے؟

ابھی دنیا سے کیا کچھ مانگنا ہے،
کیا جھپٹنا ہے......
میں سائل ہوں، لُٹیرا ہوں؟
ہوئی ہے مسخ یوں صورت کہ پہچانی نہیں جاتی!

میں کب تک جھونکتا جاؤں گا یہ تنّور
لپکی آگ سے کب نور پھوٹے گا......
کوئی ننھی کرن، دھیمی سی لو
مجھ سے کہیں تو چاندنی پھیلے
میں کب دنیا کو لوٹاؤں گا اس کے پیار کے تحفے !

پیرس
۲۰/نومبر ۸۶ء

اِبلیس

شام جب شہر کی سیر کو میں گیا،
کوئی بھی راہ میں سر بسجدہ نہ تھا،
جھک کے آداب تو دور کی بات ہے،
آشنا دُور تک ایک چہرہ نہ تھا
آج بھی میرا ابلیس مُنکر ملا!

میں نے سمجھا تھا کِھلتا رہے گا سدا
یہ کنول ذات کا،
تہہ بہ تہہ، رنگ صد رنگ، خوشبو میں
لپٹا ہوا، آگہی کے
طِلسمات کا، خود نمائی کا،
آدرش کی خواب راہوں کا
بے انت سا سلسلہ......
میرے ہاتھوں میں یہ پھول کمھلا گیا
آج بھی میرا ابلیس مُنکر ملا!

کیا کسی ساعتِ زرد میں
ناتواں شک وشبہات کو
میں نے خود ذات کے ایک ٹکڑے کی اک بے ضرر بھیک دی

اور پھر یہ امر بیل پھلتا گیا،
جال بُنتا گیا
میرا ابلیس پلتا رہا
اور اب شہر میں گونجتے قہقہے
قمقمے دور تک جھلملاتے ہوئے،
اشتہارات، جلُسے، تقاریر
تمغوں کی تقسیم کے،
یہ جلی حرف مٹتے ہوئے،
نام باریک حرفوں میں
تصویر دھندلی سی،
میری کہیں تو نہیں!

آج بھی بزمِ اغیار میں
اُس کی سرگوشیاں
مسکراتی ہوئی، لمحہ لمحہ توجہ بٹاتی ہوئی،
میں نے جھٹکیں مگر...... پھر وہ موجود تھا،
خلوتِ جاں کی پہنائیوں میں چھپا،
آگہی پر، مرے جسدِ خاکی، مری بے ثباتی پہ
ہنستا ہوا
میری عظمت کا منکر سدا،
آج بھی میرا ابلیس منکر ملا
اور میں اپنی وحدت ترستا رہا!

پیرس، ۲۴/نومبر ۸۶ء

بے نام

دریچے باز تھے،
ٹھنڈی ہوا کی نرم دستک سے،
نوائے نیم شب،
آنکھیں ٹھٹھک کر کھل گئیں۔
مہتاب کے خاموش جادو سے
سمندر بھی ہمکتا تھا۔

’’مجھے وہ نام کیا دینا
جھلک خود اسم گر کی جس میں آتی ہو،
مجھے کیوں قید کرتے ہو......
میں مٹّھی میں سما جاؤں،
طلسمی طاقتیں بے آسرا بندوں کو دہلائیں،
کہیں دیوار پر چسپاں،
گریبانوں کی زینت میں
بلاؤں سے حفاظت کر سکوں،
کیوں نام دیتے ہو!

ہزاروں قرن ہا قرنوں سے
یوں ہی چاند برسا ہے،

سمندر آہ بھرتا ہے،
معطّر پھول کے گجروں میں بس کر
فاصلوں کے لمس میں دوری تڑپتی ہے۔

مجھے محسوس کرلو......
آنکھ بھر کر دیکھ لو،
پھر نیند کی تہہ میں
تھرکتے برگ آوارہ کی صورت
ڈوبتے جاؤ،
مجھے بے نام رہنے دو۔''

پیرس
۱۴؍جنوری ۸۷ء

بے حسی...... دسمبر چھیاسی

یہ کیسا سنگین حادثہ ہے...... تمھی بتاؤ
یہ کیسا سفاک سانحہ ہے...... تمھی سمجھ لو۔

نگاہ پتھر، دہاں میں شعلے،
دُرشت ہتھیار، وار اوچھے،
ٹپکتے خوں کی زمیں پہ لالی،
بٹی ہوئی دھجّیوں میں چادر،
جدا ہوئے سر بدن سے کہہ کر:
تمہاری بے حرمتی کو آنکھوں سے کیسے دیکھیں؟
تمھی بتاؤ...... یہ کیسا سفاک حادثہ ہے!

یہ حادثہ تو نہیں...... کہ ہم نے
نفاق کے بیج بو کے دیکھا
کہ اس شجر پر رفاقتوں کے ثمر نہیں ہیں!
یہ حادثہ تو نہیں کہ
اس خارزار کھیتی کی سیم وزر سے،
لواحقینِ جہاں پنہ آپ کرتے آئے ہیں آبیاری!

مگر یہ بے حس دبیز پیکر
اب ان پہ اُترے بھی فوج نادار کرمکوں کی
تواب یہ دُم بھی نہیں ہلائیں،
یہ پچھلی باتوں کی
پچھلی یادوں کی
اب بھی کرتے ہیں غیر محسوس سی جُگالی!

پیرس
۲۲رجنوری ۸۷ء

موہنجو دڑو

یہ نین گاگر،
خیال بہتا رہا چھلک کر،
تو اب یہ بے نور ہو گئے ہیں،
یہ جسم خود ریگزار جیسا
بکھر رہا ہے،
کہ جیسے صدیوں کی قید سے روح مر گئی ہو۔

چہار جانب کھلی فضا میں
عجب للک ہے، عجب کشاکش،
عجب طلسمی فضا ہے جس میں
فرازِ ناممکنات ممکن،
مگر یہ ڈر بھی کہ اپنی پہچان کھو نہ جائے۔
تو جسم کی قید سے نکل کر،
تلاش پیہم ۔۔۔
تلاش پیہم ۔۔۔ سمٹ کے قطرے میں کیسے دریا کا روپ دھارے،
خیال کی وسعتوں کو لے کر
زمیں کے گوشوں میں پھیل جائے،
مگر تسلسل نہ ٹوٹ جائے......

ہمیں خبر ہے......
ہماری گلیوں میں روح آزاد گھومتی ہے،
تلاش میں روز و شب رہی ہے،
مگر وہ سانچے جو بے لچک ہیں
انہیں عقیدت سے توڑتی ہے،
ہمیں خبر ہے......
ہماری گلیوں میں کوئی آواز دوڑتی ہے،
تو اس سے ڈر کر
فصیل اونچی اُٹھا رہے ہیں،
ہم اپنے جسموں کے چور بن کر......
خود اپنے جسموں کو بیچ میدان چھوڑ کر بھاگتے رہے ہیں،
اتھاہ گہرائیوں میں غوطے لگا کے خود ڈوبتے رہے ہیں
موہنجوداڑو...... تجھے تو اس کی خبر ہے لیکن،
کھنڈر کو ہم دیکھ کر بھی زندہ کھنڈر کو پہچانتے نہیں ہیں۔

۲۴ر جنوری ۸۷ء

دو آتشہ

اب جو طوفانِ بلا آئے گا......
وہ، افق پر جو ابھی
سرخ، کجلا یا ہوا دھبّہ ہے،
اب جو طوفان بلا آئے گا
ریت پوشاک ہوا ناچے گی،
دیکھتے دیکھتے سورج کو گہن آئے گا۔

اب جو طوفانِ بلا آئے گا......
یہ تحفّظ کے کھلونے،
یہ فصیلیں اونچی،
سنگ مرمر کے محلّات،
چمکتے گنبد،
سرسراتی ہوئی ریتوں میں دبک جائیں گے۔

اب جو طوفانِ بلا آئے گا
کوہساروں میں دبے ظلم کا لاوا بہہ کر
شہر کے شہر، گلابوں کے چمن ڈھانپے گا،
شاہراہوں پہ کھڑی کاروں میں مردہ اجسام
ان کے ہاتھوں کے تلے ہارن کی پیہم چیخیں،

اب جو طوفانِ بلا آئے گا
اک قیامت کا سماں لائے گا!

ارض سرطان میں سرطان بہت پھیل گیا،
ہر گلی کوچے میں نفرت کی وبا،
اب جو طوفانِ بلا آئے گا......
پھیلتی جائے گی بارُود کی بو
۔۔۔اور داروغۂ بارُود دکانیں لے کر،
پھر کہیں اور، کہیں اور نکل جائیں گے!

پیرس
۲۶/جنوری ۸۷ء

تجدید

بہار آئی ہے دل دُکھانے
وہ آرزوئیں جو بادوباراں میں بہہ گئی تھیں،
جو زخم سرما کی فرغلوں میں دبک کے مایوس سو گئے تھے
بہار آئی انہیں جگانے۔

بدن کے بے جان پور پھر سے نئی امنگوں سے لہلہائے،
نسیمِ تازہ کے نرم جھونکوں کے فیض سے پیڑ تھرتھرائے،
بدلتے موسم کی ساری پچھلی رُتوں کو ہم جانتے نہیں کیا
بریدہ شاخوں کے زخم اپنی قبا پہ پہچانتے نہیں کیا
لٹی ہوئی برگِ گل کی مسموم راکھ، پتّوں کے
بے جہت قافلے نگاہوں میں بے صدا ناچتے نہیں کیا؟

بہار آئی ہے گُل کھلانے
شگفتہ، زرخیز نرم جھونکوں سے
پیڑ پتّے چمن چمن، شاخ، ٹہنیوں پہ
نئے شگوفوں میں مسکرانے پہ ایسے مامور ہو گئے ہیں
کہ جیسے خوابوں کی اب کے تعبیر اور ہو گی
کہ جیسے چاہت کی اب کے زنجیر اور ہو گی۔

۱۲/اپریل ۸۷ء

دیوارِ گریہ

یہیں تن کے خندق میں سہمی ہوئی،
روح ملبوں کے نیچے سمٹتی ہوئی،
اس کی سانسوں کی آواز آتی ہے
مدھم سی آواز سنتے چلیں۔

تن کے باہر کی دنیا میں جنگ و جدل
اور بے سمت پرواز کا خوف ہے،
تن کی دیوار اونچی کرو!
اور اونچی کرو:
جانے پہچانے، پرکھے ہوئے راستے
اور رُتبوں، مدارج کی حد بندیاں،
سمت واضح نشانوں میں لکھّا ہوا
اور رسم و روایت کی بیساکھیاں۔

اک سہارا یہاں، چند میخیں وہاں
یا نئے رنگ دیوار و در پر کریں،
جس کی بنیاد گھٹتی گئی ہو مگر
وہ کہاں تک سہاروں پہ قائم رہے......
اب تو دیوار ہے، صرف دیوار ہے

اور یہ دیوارِ گریہ ہے اس کے تلے
تحفظ کے کوُزوں کے اندر جو کوزے ہیں
اُن میں
سمٹتی، سُکڑتی، سسکتی ہوئی
روح
مدفون ہے

پیرس
۲۸؍جنوری ۸۸ء